زوال، اِنحراف اور نشاۃ ثانیہ

پروفیسر سید حسین نصر

جدیدیت (modernism) کے ظہور کے بعد کے مسلم ملکوں میں جدیدیت زدہ مسلمانوں کے ذہنوں میں بعض مخصوص مسائل ابھرنے لگے۔ یہ مسلمان جدت کو تو اپنا چکے تھے تاہم اسلام اور اس کی تاریخ سے بھی رشتہ توڑنا نہ چاہتے تھے۔ ان لوگوں میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ ان دینی اصطلاحات کو، جن کے مفہوم صدیوں سے واضح اور متعین چلے آتے ہیں، لاپرواہی سے اور مبہم انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ مغرب کی غالب فکر سے ان کے ذہن میں جو احساس کمتری پیدا ہوا ہے، اس کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے۔ مغربی معیارات اور افکار کی ذہنی غلامی یوں واضح ہوتی ہے کہ دینی الفاظ و تراکیب کو وہ مغرب میں مروج اور غالب خیالات کا جامہ پہنا دیتے ہیں، اور اس طرح اسلام کو جدید مغربی فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح جو اسلام انھوں نے پیش کیا (یا کر رہے ہیں)، وہ دراصل فکر مغرب ہی ہے، جس میں اسلام کا صرف لبادہ، کچھ الفاظ و تراکیب، اور ایک کمزور سا جذباتی بندھن تو نظر آتا ہے، مگر اس میں اسلام کی وہ عقلی اور روحانی حقیقت مفقود نظر آتی ہے، جو اسلام کی اصل شناخت ہے۔ اس مضمون میں ہم ان تین اصطلاحات پر گفتگو کریں گے، جو اسلامی تاریخ اور آج کی اسلامی دنیا کے حوالے سے اکثر استعمال ہوتی ہیں، اور جدیدیت زدہ مسلمانوں کے فکری رویے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ اصطلاحات ہیں: ''زوال و انحطاط'' ''انحراف'' اور ''نشاۃ ثانیہ''۔

''زوال'' کی اصطلاح کو لیجیے، جو جدید مسلم مصنفین کثرت سے استعمال کرتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کے آغاز سے قبل اسلامی دنیا ''زوال پذیر'' تھی۔ سوال یہ ہے کہ ''زوال'' کس حوالے سے؟

کسی چیز کے عروج و زوال کو ناپنے کے لیے ایک معیار یا پیمانہ درکار ہوتا ہے، جس پر پرکھ کر ہی اسے ''عروج'' پانے والی یا ''زوال'' کا شکار کہا جائے گا۔ یہاں اگرچہ بعض لوگوں نے معیار، اسلام کے قرون اولیٰ کو بنایا ہے، تاہم اکثر لوگ، شعوری یا غیر شعوری طور پر مغرب کے نظام اقدار ہی کو عروج

و زوال کی کسوٹی بنا لیتے ہیں۔ مثلاً سائنس کے مسئلے کو لیجیے۔ اکثر اہل مشرق کی طرح بہت سے "جدید مسلمان" بھی سائنس اور تہذیب کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے اور اس کی تہذیب و ثقافت کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سائنس کا فروغ کس قدر ہے۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے وہ خود تاریخ سائنس کا دیا ہوا سبق بھی فراموش کر جاتے ہیں (۱)۔

اس خود ساختہ معیار عروج و زوال کے مطابق اسلامی تہذیب کے زوال کا نقطہ آغاز اس وقت سے تصور کیا جاتا ہے 'جب وہاں ممتاز سائنس داں پیدا ہونے بند ہوگئے۔ ("سائنس داں" کا تصور بھی وہی لیا جاتا ہے 'جو آج کا مغربی تصور ہے)۔ بہت سے مسلمان مصنفین اس وقت کا تعین بھی مغربی مورخین اور دانش وروں کی کتابوں سے کرتے ہیں۔ ان مغربی اہل قلم کا حال یہ ہے کہ ان کی اسلام کی عقلی و ذہنی زندگی سے دلچسپی اس دور تک محدود ہے 'جب اسلام 'مغرب کو متاثر کر رہا تھا۔

اس رویے کے مطابق فلسفے سے ریاضی تک 'اسلام کی ہر چیز ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) کے قریب اچانک پراسرار طور پر "زوال" کا شکار نظر آنے لگتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے' جب مغرب اور اسلام کے عقلی روابط عملاً ختم ہو چکے تھے (۲)۔ بدقسمتی سے اس رائے کے حامل ہمارے ان جدید مسلم مصنفین نے اس سلسلے میں نہ تو کبھی ذاتی تحقیق کی زحمت کی' اور نہ ہی بعض مغربی ماہرین کی حالیہ (اور نسبتاً کم معروف) تحقیق پر غور کیا' جو یہ بتاتے ہیں کہ نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں بھی مسلمانوں کا علم فلکیات میں اہم مقام رہا ہے' نیز یہ کہ چودھویں صدی ہجری' (اٹھارھویں / انیسویں صدی عیسوی) میں مسلمانوں کا علم طب' ایران اور ہندستان میں بڑا جاندار تھا (۳)۔

"زوال" کا یہ مروج تصور' جو "تہذیب" کے دنیاوی پہلو کے بارے میں مروج مغربی معیارات کے مطابق ہے' روایتی اسلامی نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے' جس کے مطابق قرن اول کا مدینہ ہی کامل ترین انسانی معاشرے کا نمونہ تھا' کہ اسی کے معیار پر باقی تمام اسلامی معاشروں کو پرکھا جاسکتا ہے۔

اسی غلط تصور زوال کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں کے ذہن سکڑ کر کمزور ہوگئے' انھیں خود پر' اپنی ثقافت پر اعتماد نہ رہا۔ اسلامی دنیا پر زوال تو آیا ہے' مگر یہ "بڑھاپے" کے تدریجی اور فطری عمل' نیز عہد وحی سے بتدریج دوری کی وجہ سے ہوا ہے۔ مگر ہمارے یہ دانش ور' زوال کی اس طرح تصویر کشی کرنے اور یہ بتانے کی بجائے کہ یہ انحطاط بالکل حالیہ ہے' یہ بتاتے ہیں کہ اسلامی دنیا ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) ہی سے زوال کا شکار ہوتی چلی آئی ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ اگر یوں ہوتا' تو یہ بات ممکن نہ تھی کہ اسلام آج تک ایک وسیع تہذیب کی

پرورش کر پاتا' اور ایک زندہ قوت کے طور پر باقی رہ جاتا۔ یہ لوگ اسلام کی زندہ جاوید روحانی روایت کو فراموش کر دیتے ہیں' جو تصوف کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ یہ اصفہان کی مسجد شاہ' استنبول کی نیلی مسجد' یا تاج محل جیسے فن تعمیر کے شاہ کاروں' صائب تبریزی اور جامی کے ادبی شہ پاروں اور شیخ احمد سرہندی "اور ملا صدرا" کی مابعد الطبیعیات اور علم کلام کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر زوال وہی ہوتا اور اسلامی دنیا کو زوال نے اسی تاریخ سے اپنی گرفت میں لیا ہوتا' جو ان جدیدیت زدہ مسلم مصنفین نے (جنھوں نے مغرب کے معیار عروج و زوال کاملاً اپنا رکھے ہیں) فرض کر لیا ہے' تو آج دنیا میں اسلامی تہذیب نام کی کوئی چیز باقی نہ ہوتی جس میں "جان ڈالنے" کی یہ کوشش کر رہے ہیں۔ اسلامی تہذیب مرکھپ کر آثار قدیمہ میں شامل ہو چکی ہوتی' جیسا کہ بعض مستشرقین کی خواہش ہے۔

دوسرا لفظ ہے "انحراف"۔ اس کو متجددین (جدیدیت کے پرستار) کم ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح عموماً ان مسلمان مصنفین کے ہاں نظر آتی ہے جو ہمارے روحانی اور مذہبی معیار کی موجودگی سے واقف ہیں' ایسا معیار جس پر اپنے معاشرے سمیت کسی بھی انسانی معاشرے کو جانا پرکھا جا سکتا ہے۔ لفظ "الدین" کے وسیع تر معنی میں "روایت" کا ذکر انحراف کے امکان کے ہم معنی ہے۔ انحراف کی اصطلاح کا اگر کوئی موزوں استعمال ہے' تو وہ مغربی تہذیب ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔ شیخ عبدالواحد یحیٰی (رینے گینوں) کے الفاظ میں یہ تہذیب مغربی ایک مہمل عجوبہ نہ بھی ہو' تو ایک بڑا انحراف اور بے قاعدگی ضرور ہے (۵)۔ مگر ہم جن تجدد پسند مسلم مصنفین کا ذکر کر رہے ہیں' وہ اس لفظ (انحراف) کو اس حوالے سے استعمال کرتے ہوئے شرماتے ہیں' کیوں کہ ان کے پاس وہ معروضی معیار ہی نہیں' جس کے ذریعے کسی مخصوص دنیا کے اپنے زمانی و مکانی حالات کا تعین کرنے والے زمانی تغیر پر کوئی حکم لگایا جا سکے' کیوں کہ ایسے معیار کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود تغیر سے ماورا ہو۔ یہ بات تعجب انگیز ہے۔ کیوں کہ ہمارے اسلامی مصادر میں ایسا مواد موجود ہے' جس کی روشنی میں اس طرح کے معیار کی تشکیل ہو سکے' اور اس کے ذریعے معاصرین کے لیے قابل فہم زبان میں تنقید بھی وضع کی جا سکتی ہے۔

تیسری اصطلاح' جس کا ادب' آرٹ' سیاست غرض ہر شعبے میں اندھا دھند استعمال ہو رہا ہے' "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) ہے۔ ہمارے متجددین اسلامی دنیا میں وقوع پذیر کم و بیش ہر طرح کے عمل کے لیے "نشاۃ ثانیہ" کی اصطلاح نہایت فراخ دلی کے ساتھ استعمال کر لیتے ہیں۔ معاصر عربی ادب میں اس کے لیے "النھضۃ" کا استعمال ہوتا ہے' اور بے تحاشا ہوتا ہے۔

نشاۃ ثانیہ کے استعمال میں بھی ایک طرح کا فریب پوشیدہ ہے۔ اس لفظ کو پڑھ کر ہمارا ذہن

فوراً مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس تحریک نے یورپ میں یونانی اور رومی اصنام پرستی (paganism) کے ان عناصر کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا، جو روحانی طور پر مہلک تھے۔ تاہم قدیم روایت کے وہ مثبت عناصر جنھیں آبائے کلیسا، خصوصاً سینٹ آگسٹائن نے عیسائیت میں شامل کر لیا تھا، انھیں اس تحریک میں شامل نہ کیا گیا۔ ان عناصر نے عیسائی تہذیب کو وہ نقصان پہنچایا کہ وہ صحیح عیسائی تہذیب کی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے طبعی مدارج تک پہنچ ہی نہ سکی۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ کا ذکر آئے تو پرومیتھائی (promethean) اور طیطانی (titanesque) روح اور رویے (۶) کا دوبارہ سر اٹھانا بھی ضرور یاد آئے گا، جو اسلام کے رویے کے بالکل متضاد ہے (۷)۔

اب صورت حال یہ ہے کہ آج کے مسلمان عام طور پر جس چیز کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کہہ دیتے سمجھ لیتے ہیں، وہ کسی نہ کسی انداز میں انھی قوتوں کی حیات نو ہوتی ہے، جن کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا۔ یہ وہی قوتیں ہیں، جنھیں اسلامی روایت میں جاہلیت کے عہد سے منسوب کیا گیا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کسی خاص شعبے میں اور جزوی طور پر بھی اسلام میں کسی "احیا" کا امکان ہی نہیں۔ مثلاً کسی بڑے بزرگ یا ولی اللہ کے ہاتھوں مسلم دنیا کے کسی خاص حصے میں روحانیت کا احیا ہو سکتا ہے (۸)، اسلامی فنون میں کسی خاص شعبے کی فنی ہیئت کی کوئی نئی تشکیل ہو سکتی ہے، کسی دانش ور کے ہاتھوں، اسلام کی فکر کے کچھ مخصوص پہلوؤں کا صیقل ہو جانا بھی ممکن ہے، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مفکر خود بھی اسلام کی ذہنی روایت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہو (۹)۔ بدقسمتی سے آج کل اسلام کے "احیا" کے نام پر جو کام ہو رہے ہیں، وہ حقیقتاً احیائے اسلام نہیں۔ اکثر کھلی ہوئی خلاف اسلام فکر کو اسلامی فکر کی "نشاۃ ثانیہ" قرار دے کر اس کی خوب واہ واہ ہوتی ہے۔ شریعت کے صریحاً مخالف عمل کو بھی اسلام کی سماجی نشاۃ ثانیہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر کسی نئے رجحان / فکر کو "نشاۃ ثانیہ" قرار دینا ضروری ہو، تو کم از کم اس کے ساتھ "اسلامی" کا لفظ تو نہ چپکایا جائے۔ یہاں بھی وہی اسلام کے اصل معیارات کے ادراک سے محرومی نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے جدید دنیا کی گمراہیوں کے شکار یہ لوگ اسلامی دنیا میں ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو نشاۃ ثانیہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے، جیسے مغربی دنیا اور اس کے زیر اثر دوسرے ملکوں میں اہل مغرب سے متاثر لوگ ہر تبدیلی کو "ترقی" اور "پیش رفت" قرار دے ڈالتے ہیں، خواہ اس تبدیلی کے زیر اثر روح انسانیت کی تذلیل اور تحقیر ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔

ان سب میں ایک غلطی مشترک ہے۔ یہ غلطی اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ معروضی، اٹل اور زمان و مکان سے ماورا اسلامی اصولوں کی بصیرت ہی سے یہ لوگ محروم ہو گئے ہیں۔ اسلام کے انھی اصولوں کی روشنی میں کسی عہد میں انسانی معاشرے کے کسی عمل یا کسی دور کے بارے میں ہم یہ کہہ

سکتے تھے کہ وہ زوال پذیر ہے' اس میں انحراف نظر آتا ہے' یا نشاۃ اور "ترقی" صحیح معنوں میں اسلامی احیا کی صفات لیے ہوئے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ذات مطلق (الاحد) کے حوالے کے بغیر کسی مقید اور موضوعی یا اضافی (relative) کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ غیر متغیر کے ذریعے ہی اس چیز کا بھاؤ تاؤ اور جانچا جا سکتا ہے' جو متغیر اور متحرک ہے۔ قائم و دائم ہستی کے حوالے کے بغیر تغیرات کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن ہی نہیں' یہ کوشش ایک فلسفیانہ بے بصیرتی ہوگی۔

اب صورت یہ ہے کہ مغرب کی غلطیوں کی اندھی پیروی نے' جو خود بھی "القیوم" کی بصیرت سے عاری ہو چکا ہے' ہمارے ان "جدیدیت کا شکار" مسلم مفکرین اور اہل قلم کے پاس نہ تو وہ ذہنی استعداد اور بصیرت باقی چھوڑی ہے' جس سے وہ اشیا کے غیر متغیر اصول (جواہر یا اعیان ثابتہ) کا ادراک کر سکیں (قرآن انھیں "ملکوت" کے نام سے پکارتا ہے) اور نہ ہی ان میں وہ راسخ ایمان موجود ہے' جس کی مدد سے وہ روایت نبویہ (یعنی سنت اور حدیث) سے حاصل ہونے والی مثال پر عامل ہو سکیں اور اس کے دیے ہوئے معیار پر ثابت قدم رہ سکیں۔

چوں کہ اشیا کے غیر متغیر اصولوں تک رسائی کے راستوں میں پہلا طریق ذہنی اور روحانی نوعیت کا ہے' اس لیے ہمارے متجددین جب اس سے انحراف کرتے ہیں' تو انھیں عام لوگوں کی طرف سے کسی خاص مخالفت یا مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' (کیوں کہ عام لوگوں کی ذہنی سطح ہی ایسی نہیں کہ وہ اس کے مضمرات کو سمجھ سکیں) اس لیے یہ اپنی پوری قوت اور توانائی روایتی اسلام کے غیر متغیر اصولوں کو ڈھانے میں صرف کرتے ہیں۔ یہی غیر متغیر اصول عام مسلمان کے "ایمان" کی اصل ہوتے ہیں' اس لیے ان پر زد پڑتی ہے تو عام مسلمان کی طرف سے مخالفت لازماً ہوتی ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ان متجددین کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے: ان معروضی اسلامی معیارات یا کسی شے کی قدر و قیمت متعین کرنے والے ان اصولوں کو منہدم کر دیا جائے' جن کے ذریعے آج کے مسلم معاشرے اور دنیائے جدید کو پرکھا جانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ان معروضی اسلامی اصولوں سے روگردانی کی جو خواہش آج کے "مسلم متجددین" میں نظر آتی ہے' اس کا سارا زور اس پر صرف ہوتا ہے کہ کسی طرح سنت نبوی اور حدیث نبوی ؐ کی اس معنویت کو کمزور کر دیا جائے جو تاریخ کے تمام ادوار پر محیط نظر آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے "تاریخی تنقید" کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے' جس کے ذریعے ہر اس چیز کا انکار کر دیا جاتا ہے جو کہیں تحریری طور پر موجود نہ ہو۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی اور اجتماعی' دونوں طریقوں سے مسلمانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک کامل نمونہ عطا کر دیا ہے (جسے قرآن مجید "اسوۂ حسنہ" کہتا ہے)۔ جب تک آپ ؐ کی سنت کا احترام ہو گا' اسے ایک معیار کے طور پر باقی

رکھا جائے گا، اس وقت تک دراصل ملت اسلامیہ میں اللہ کا مقرر کردہ وہ معیار بھی قائم رہے گا، جس کے ذریعے ہی انسانی رویے اور عمل کو حقیقتاً پرکھا جاسکتا ہے۔ یوں کہ یہی اسوۂ حسنہ کتاب اللہ کے ساتھ مل کر انسانی معاشرے کی اجتماعی زندگی، نیز افراد کی داخلی مذہبی زندگی کی اساس کے لیے لوازم مہیا کرتا ہے (۱۰)۔ ذخیرۂ حدیث کی صحت پر تنقید اور اسے ناقابل اعتبار ٹھہرانے کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی اس کسوٹی ہی کو غیر معتبر ٹھہرا دیا جائے، جس کے ذریعے مسلمان اپنے معاملات کو پرکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اس کا شعور بھی نہ ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں، مگر عملاً اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے لیے جدیدیت کی نقالی میں آسانی ہو جاتی ہے، اور اپنی خواہشوں کی پیروی یا زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے میں دشواری نہیں ہوتی، خواہ یہ طور طریقے کیسے ہی ابلیسی ہوں۔ یہ سارا عمل "اسلامی نشاۃ ثانیہ" کے نام پر کیا جاتا ہے، اور ان تمام لوگوں پر، جو مغربی تہذیب کے گھٹیا، بازاری چلن کی اندھی پیروی کا انکار کرتے ہیں، رجعت پرست اور زوال پذیر کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔

متجددین، اسلام کے ماضی اور حال کے بارے میں جو مبہم اور عموماً شرمناک فتوے دیتے ہیں، ان کا ان کوششوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے جن کے ذریعے وہ قرآن و سنت کی دی ہوئی کسوٹی اور معیارات کو دھندلا دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے دین دار اور اہل استقامت مسلمان، حدیث اور سنت میں دیے گئے معیار پر اسی لیے زور دیتے ہیں کہ اس کے بغیر خود قرآن کے پیغام کے کئی حصے ناقابل فہم ہو کر رہ جائیں گے۔

کہا جاسکتا ہے کہ زوال، انحراف اور نشاۃ ثانیہ جیسی اصطلاحات کے مروجہ استعمال پر تنقید بجا، لیکن اگر ہم قرآن و سنت کو سند مان لیں، اور اسلامی روایت کو قبول کرلیں، تو ان اصطلاحات کا مفہوم کیا ہوگا؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب اس سے بالکل مختلف ہوگا، جو اسلام کے متجددین پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے حوالے سے "نشاۃ ثانیہ" کے معنی صرف اسلامی اصولوں اور معیارات کے از سرنو ظہور کے ہیں۔ ہر اوٹ پٹانگ نظریے کو اسلام سے وابستہ کرنے کو نشاۃ ثانیہ کہنا غلط ہوگا۔ زندگی کی ہر لہر کو حیات روحانی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا، اور ہر وہ عمل جو مسلم اقوام میں ظہور پذیر ہو، لازماً اسلامی عمل نہیں ہوگا، خصوصاً آج کے دور میں جب "الحق" پر گہر چھا چکی ہے۔ اسلامی اصطلاح میں نشاۃ ثانیہ، تجدید دین کا وہ عمل ہے، جو اپنے روایتی معنوں میں مجدد ہی سے ظہور میں آسکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں، جہاں کسی مجدد نے اپنے کار تجدید سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ مگر ایسا مجدد ہمیشہ خود بھی صحیح اسلامی اصولوں کا کامل نمونہ ہوتا ہے۔ انھی اصولوں کی بازیافت کر کے

اور ان پر تنقید کے ذریعے وہ صورت احوال کی اصلاح کرتا ہے مگر اس میں اور آج کل کے مصلحین میں بڑا فرق ہے۔ آج کے مصلح تعمیر کی بجائے تخریب کے ہرکارے ہیں۔ یہ کسی اسلامی روایت کے کسی اٹل پہلو کو کسی عارضی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اس مصلحت کے بارے میں ان کا عام طور پر دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ "یہ زمانے کی ناگزیر ضرورت ہے' اس کے بغیر چارہ نہیں"۔

اگر ایسے "مصلحین" تاتاریوں کی یلغار کے دور میں اور اس کے فوراً بعد ابھرتے تو نہ جانے اسلام کی کیا صورت بن جاتی۔ یقیناً وہ مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ منگول فاتحین اور ان کے طور طریقوں کی پابندی ہی "مصلحت" اور "ضرورت زمانہ" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسلامی نشاۃ ثانیہ' سچے اور کھرے اسلامی اصولوں کی بازیافت اور ان کے از سرنو رواج کا نام ہے۔ کسی بھی بدلتے ہوئے فیشن کی اتباع کو نشاۃ ثانیہ نہیں کہہ سکتے۔

مندرجہ بالا معروضات سے ایک سچی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی ایک شرط تو واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ شرط یہ ہے کہ ہم مغرب کے اثر سے آزاد ہو جائیں' اور اس سب سے بیزاری کا اظہار کریں جو مغربی فکر و تہذیب کا خاصہ ہے۔ جدیدیت کے اثرات سے دور (اور محفوظ) ایک مسلمان کو شاید ایک روحانی تجدید کا تجربہ ہو سکتا ہے' چاہے وہ شخص دنیائے جدید سے کتنا ہی بے خبر ہو۔ مگر ایک مسلم دانش ور اور مذہبی راہ نما کے لیے' جو اسلامی دنیا میں ایک ذہنی اور سماجی احیا کا خواہش مند ہے' یہ بھی لازم ہو گا کہ وہ پہلے جدیدیت پر تنقیدی نظر ڈالے اور دنیائے جدید کا ایک وسیع تناظر میں تنقیدی جائزہ لے۔ اس کے بغیر اس کے لیے ممکن نہ ہو گا کہ اسلامی دنیا کی ذہنی یا سماجی سطح پر نشاۃ ثانیہ کے لیے کوئی پیش رفت کر سکے' کیوں کہ اسلامی دنیا آج مغرب اور اس کی پروردہ جدیدیت کے زبردست دباؤ کا شکار ہے۔ ایک طرف تو ہم اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بات کریں' اور ساتھ ہی ان فکری معیارات کو بھی قبول کر لیں جو مغرب ہمیں دیتا ہے' تو ہمیں ایک سراب کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکے گا۔ خالص اسلامی فکر' اور اس کی روشنی میں ایک لائحہ عمل کی تشکیل' جدید دنیا کے گہرے فہم اور اس پر بالغ نظری کے ساتھ تنقیدی رویے ہی سے ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلامی قانون اور فقہ اسلامی کے میدان میں صحیح اجتہاد اور درست فتویٰ اس ذہن کی رسائی سے ماورا ہے' جو جدیدیت کے عقائد کو قبول کر کے خود بھی تبدیل ہو چکا ہو۔ گذشتہ ایک صدی سے "مسلم مجددین" اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بارے میں شور و غوغا کر رہے ہیں' مگر ابھی تک ایسی کوئی چیز منصہ شہود پر موجود نہیں۔ کم از کم ہمارے "جدیدیوں" کے ہاں سے تو کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہو سکی۔ اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں: یہ لوگ تنقیدی نظر سے عاری ہیں'

دنیاے جدید کا گہرا فہم بھی نہیں رکھتے اور ان وسائل سے بھی تہی دامن ہیں، جو دنیاے جدید کی آنی جانی اور روز بدلتی ہوئی اقدار کو اسلام کے ابدی اصولوں پر جانچنے پرکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی جانب سے بولنے والے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواہش مند لوگ مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری لیے ہوے گفتگو کرنا چھوڑ دیں، اور معذرت خواہانہ رویے کو ترک کر کے خود پیش قدمی کریں، اور جدید دنیا کے طلسم کدے پر اسلام کے مابعد الطبیعیاتی فرقان کی وہ ضرب لگائیں، جو خالص ترین صورت میں کلمہ شہادت میں موجود ہے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

اس منظر نامے کے حوالے سے "زوال" اور "انحراف" جیسے الفاظ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ زوال، نام ہے ایسی حالت کا، جس میں کوئی قوم یا گروہ ایک مقررہ معیار سے گر جائے۔ زوال کے تصور میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ معیار کو نہیں بدل رہے ہیں، بلکہ اسی پر جانچ اور پرکھ رہے ہیں۔ اور انحراف کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس معیار ہی کو ترک کر کے اپنے لیے کوئی دوسرا پیمانہ اختیار کر رہے ہیں۔

زوال کی دو قسمیں ہیں: زوال افعال اور زوال منفعل۔ مشرق کی تہذیبوں پر گذشتہ چند صدیوں سے جو زوال چھایا ہوا ہے، وہ زوال منفعل ہے اور اول الذکر زوال وہ ہے، جس کا شکار خود مغرب ہے (۱۱)۔ مغرب کی حرکی اور فعال فطرت کی وجہ سے یہ زوال حقیقتاً انحراف بن گیا ہے۔ بہت سے مسلمانوں اور مشرق کے اکثر لوگوں نے اس فعالیت اور حرکت ہی کو سچی درست زندگی سمجھ لیا ہے، محض اس وجہ سے کہ اس میں مشرق کی بے عملی اور انفعالی زوال کے مقابلے میں حرکت اور زندگی نظر آتی ہے۔ مگر اب صورت حال یہ ہے کہ آج بہت سے جدیدیت زدہ مشرقیوں کی چشم حیران کے آگے، مغرب کا یہ انحرافی زوال ایسی شکل میں متشکل ہو رہا ہے کہ وہ بھی اسے زوال اور تباہی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ صاف نظر آتا ہے کہ جدید مغربی زندگی کا خط منحنی (curve) جس کی ابتدا قرون وسطیٰ میں اس وقت ہوئی تھی جب مغرب نے انسان کی معمول کی روحانیت مسترد کر کے اسے پس پشت ڈال دیا تھا، اب "نشاۃ ثانیہ" سے گزر کر انحراف اور اس طرح ایک "زوال" کو پہنچ رہا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں اس انحرافی زوال کو بہت واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

"اسلامی جدیدئین" (جنھیں ہم متجددین بھی کہہ آئے ہیں) نے اسلام کی جو تعبیر پیش کی ہے، اگر اس کا گراف بنایا جائے، تو وہ زوال سے "نشاۃ ثانیہ" اور وہاں سے "انحراف" کی طرف جائے گا۔ اس کے بعد پھر زوال کا ایک مرحلہ درپیش ہو گا، مگر یہ اس زوال سے مختلف ہو گا، جسے ذہن میں رکھ کر اور جس کے علاج کے لیے ان لوگوں نے حرکت شروع کی تھی۔ خوش قسمتی سے اسلامی روایت کا

"اجماع" اسے مسترد کرتا آیا ہے۔

دونوں طرح کے زوال سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ یہ کہ پرفریب راستوں کو چھوڑ کر اسلام کے ابدی اور غیر متغیر اصولوں پر نظر رکھی جائے اور انھی سے وابستگی کو مستحکم کیا جائے کہ یہ آنی جانی تحریکوں سے بالا ہیں۔ انھی اصولوں کی کلید سے ہر اس صورت حال کی کشائش کی جائے' جس کا مسلمانوں کو سامنا ہو' اور انھی کی کسوٹی پر ہر اس "دنیا" کو پرکھا جائے جو ہمارے مقابل ہو۔ کسی فانی "دنیا" یا زمان و مکاں کے گزرتے ہوئے حوادث کو اسلام کی تعلیمات اور اصولوں کی سچائی کے لیے کسوٹی بنالینا ایک الٹا کام ہو گا' جیسے گھوڑے کے آگے گاڑی جوت دی جائے۔ اس غلطی کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ ہم بھی اس راہ گمرہی پر چل پڑیں گے' جس پر مغرب چل پڑا تھا' اور جس کے نتیجے میں وہ اس پیچیدہ صورت حال کا شکار ہے کہ مغربی تہذیب کے ساتھ کرۂ ارض پر وجود انسانی کی بقا ہی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

مسلمان دانش وروں کے لیے کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ جدید مغرب کے ان مراحل کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں' جو اسے موجودہ بحران سے دوچار کر چکے ہیں اگر وہ اسلام کی حمایت کرنا چاہتے ہیں' اور اس کی حیات نو کے خواہش مند ہیں' تو وہ یہ یاد رکھیں کہ یہ ایک آسان کام نہیں۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ انھیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ حق پر موت' باطل کی زندگی سے بہتر ہے۔ اگر ملت اسلامیہ کی تجدید حیات مطلوب ہو' تو یہ ایک ایسی زندگی کی تجدید ہونی چاہیے' جس کی جڑیں عالم قدس میں مضبوطی سے پیوست ہوں۔ زوال اور انحراف سے بچنے اور ایک حقیقی نشاۃ ثانیہ تک پہنچنے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ اپنی زندگی اور مسائل کو وحی ربانی کے بتائے ہوئے ان اصولوں کے مطابق مرتب کیا جائے' جو ہمیشہ سے مستند اور صحیح ہیں۔ اور ہمیشہ ہی ایسے رہیں گے مگر ان اصولوں کا اطلاق' باہر کی دنیا اور دوسروں پر کرنے سے پہلے اپنی ذات پر کرنا ہو گا۔ انسان اس وقت اپنے گردوپیش کی دنیا کو دوبارہ زندہ کرنے کے قابل ہوتا ہے' جب وہ پہلے خود حیات نو حاصل کر چکا ہو۔ آج کے تمام سچے مصلح' جدید دنیا کے ناکام مصلحین (جن میں بعض نیک نیت بھی تھے) کی ناکامیوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور وہ سبق یہ ہے کہ دنیا کی حقیقی اصلاح کا آغاز خود اپنی اصلاح سے ہونا چاہیے۔ جس نے خود کو فتح کر لیا' اس نے دنیا کی تسخیر کر لی اور جس شخص کی ذات میں اسلام کے دیے ہوئے اصولوں کی ان کی پوری وسعت کے ساتھ تجدید ہو گئی' اس نے اسلام کی حقیقی "نشاۃ ثانیہ" کے لیے سب سے بنیادی قدم اٹھا لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف وہی شخص اپنے گردوپیش کی دنیا کے جسد مردہ میں روح پھونک سکتا ہے' اور اسے نئی زندگی عطا کر سکتا ہے' جو ذات الٰہی "الحق" میں دوبارہ زندگی پا چکا ہو۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!
[جس کا دل عشق (الٰہی) سے زندہ ہو گیا، اسے ہرگز موت نہیں آتی۔ لوح عالم پر ہماری ہیشگی کے نقوش ثبت ہیں]۔

اس دنیا کی وسعت اور حدود کیا ہوں گی، اس کا انحصار مشیت الٰہی پر ہی ہے۔

(ترجمہ: سہیل عمر۔ تلخیص و تسہیل: پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

حواشی

(۱) دیکھیے: سید حسین نصر، اسلام میں سائنس اور تمدن، جہاں اس مسئلے کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے، خصوصاً تعارف میں، صفحہ ۲۱۔ Science and Civilization in Islam

(۲) گو عثمانی ترکوں اور یورپ کے مابین روابط تھے مگر ان کی نوعیت اس تبادلہ عقلی سے بالکل مختلف تھی جس نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی۔

(۳) فلسفہ اسلام کی صورت حال اور بھی حیران کن ہے۔ اس لیے کہ فلسفہ اسلام اور اسلامی ماوراء الطبیعیات کا فی الحقیقت کبھی زوال ہوا ہی نہیں۔ دیکھیے: سید حسین نصر Islamic Studies باب ۸ اور باب ۹۔ نصر "ایران میں اسلامی فلسفے کی روایت اور جدید دنیا کے لیے اس کی معنویت" نیز نصر، "ایران اور اسلامی فلسفے کا مستقبل"۔

Studies in Comparative Religion Winter 1972. pp 31-42

(۴) اہل مغرب کے لیے خاص طور پر سترہویں صدی کے بعد سے "تہذیب" کلیتاً انسان سے متعلق بلکہ فی الاصل انسان خاکی کی خود کو ترقی دینے کی کوشش کے مترادف ہو چکی ہے۔ لوئی چہار دہم کے ساتھ یہ رویہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ دیکھیے:

F.Schuon: "Remarks on Some Kings of France", Studies in Cómparative Religion. Winter 1972 pp 211

(۵) دیکھیے: دنیائے جدید پر گینوں کی دو بنیادی تصانیف:

Crisis of the Modern World Reign of Quantity and the Sign of Times

نیز دیکھیے F.Schuon کا ماہرانہ تجزیہ Light on the Acient Worlds

(۶) یونانی صنمیات کے مطابق پرومیتھوس (Prometheus) وہ باغی ہیرو ہے، جو دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف آسمانوں سے آگ چرا کر لے آیا۔ اس نے انسانوں کو اس کا استعمال اور بہت سے مفید فنون سکھائے۔ سزا کے طور پر (یونانیوں کے) خدائے اکبر زیوس (Zeus) نے ایک چٹان کے ساتھ زنجیر میں باندھ دیا تھا۔ ہیراکلیس نے اسے رہائی دلائی۔ طیطان (Titans) بھی یونانی صنمیات میں بغاوت کی علامت ہیں۔ یورے نس اور زمین کے ان دیوہیکل بیٹوں نے زیوس دیوتا کے خلاف

بغاوت کی تھی، اور زیر زمین قید کر دیے گئے تھے (ع-ق-س)

(۷) ہر وہ مسلمان جس کا ذوق فن پوری طرح نہیں تباہ ہو چکا، نشاۃ ثانیہ کے اور سترہویں اٹھارہویں صدی کے بے ڈھنگے آرٹ اور فن تعمیر کی دنیاوی نوعیت سے گھن کھائے گا، خواہ یہ فن مذہبی قسم کا ہی کیوں نہ رہا ہو۔ یہ آرٹ جو مسلمان نظارہ کنندہ کو اتنا غیرروحانی اور دنیاوی لگتا ہے، صرف رب السموات کے خلاف اس بغاوت کا عکس ہے جو نشاۃ ثانیہ کی انسان پرستی میں رچی ہوئی تھی۔ اور جو مغرب میں انسان کو مظہر الٰہی (Imago Dei) سمجھنے والے روایتی تصور انسان کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

(۸) اس قسم کے احیا کی مثال کے طور پر اس صدی کے آغاز پر عظیم الجزائری صوفی مرشد شیخ العلوی کے منظر عام پر آنے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ دیکھیے: ابوبکر سراج الدین۔

Martin Lings. A Sufi Saint of the Twentieth Century

(۹) دیکھیے: H. Corbin, The Force of Traditional Philosophy in Iran today.

(۱۰) حدیث نبوی کی معنویت اور اس کے جدید ناقدین کے رد کے لیے دیکھیے:

S.H. Nasr: Ideals and Realities of Islam. pp 79ff.

F.Schuon: Understanding Islam, Ch. 3

S.M Yusuf: An Essay on the Sunnah, Lahore, 1966.

(۱۱) زوال سب تہذیبوں پر آیا ہے، مگر اس زوال کے انداز الگ الگ رہے ہیں۔ مشرق کا زوال انفعالی ہے اور مغرب کا حرکی۔ مشرق کا زوال اس کی لغزش سے ہوا کہ اس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مغرب کا زوال زیادہ سوچنے اور غلط سوچنے سے ہے۔ "مشرق حقائق پر محو خواب ہے: مغرب گمراہیوں میں زندہ ہے"۔

F.Schuon: Spiritual Perspectives and Human Facts. p 22.